امام شناسی، علم تاریخ اور علم کلام کی روشنی میں

IMAMOLOGY_ FROM THE VIEWPOINT OF HISTORY & THEOLOGY

Dr. Hassan Hazti

Translation: Dr. Qaiser Abbas Jafri

Abstract:

According to the belief of the Shia Muslims, their Imams are endowed with some superhuman qualities, such as knowledge of the unseen, infallibility and miracles, etc. Shia believe in this. But, history is a knowledge that is based on scientific methodology. Therefore, instead of considering the superhuman perfections associated with the Imams, it emphasizes the historical facts that the youth are connected with human characteristics. On the other hand, superhuman qualities are most preferred by theologians. The most important issue in this article is how the supernatural actions and miracles of the Shia Imams can be proved to be natural and regular through a historical study.

***Key words**: Imam, Shia, History, Theology, Superhuman.*

خلاصہ

شیعہ مسلمانوں کے عقائد کے مطابق بارہ امامؑ ایسے مقدس مرتبہ کے حامل ہیں کہ جو انہیں بعض مافوق انسانی خصوصیات سے بہرہ مند کرتا ہے، جیسا کہ علم غیب، عصمت اور صاحب کرامات ہونا وغیرہ۔ شیعوں کا اس پر کامل یقین ہے۔ لیکن علم تاریخ سائنسی طریقہ کار پر مبنی علم ہے۔ اس لئے یہ آئمہ طاہرینؑ سے مربوط مافوق انسانی کمالات پر غور کرنے کی بجائے ان تاریخی حقائق پر تاکید کرتا ہے کہ جو انسانی خصوصیات سے مربوط ہیں۔ دوسری طرف، متکلمین کے لئے مافوق انسانی صفات بیشتر پسندیدہ ہیں۔ اس مقالہ میں مہمترین مسئلہ یہ ہے کہ ایک تاریخی تحقیق کے ذریعے آئمہؑ کے مافوق انسانی افعال اور معجزات وغیرہ کو کس طرح طبیعی اور قاعدہ مند ثابت کیا جا سکتا ہے؟

کلیدی کلمات: امام، شیعہ، تاریخ، علم الکلام، مافوق انسانی۔

مقدمہ مترجم

اکثر دانشوروں کا خیال ہے کہ معلومات کی جمع آوری (Data collection) کو ریسرچ ورک کا نام پر پیش کرنا لفظ تحقیق کا مذاق اڑانا ہی نہیں، بلکہ نئے محققین کو گمراہ کرنے اور علم کی تولید (Production of Knowledge) کا دروازہ بند کرنے کے مترادف بھی ہے۔ لہٰذا معلومات کی جمع آوری سے یہ بہتر ہے کہ مختلف زبانوں میں انجام دی گئی اچھی، مفید اور بہترین تحقیقات کو اپنی زبان میں ترجمہ کرکے علمی حلقوں کے مطالعہ کی نظر کردیا جائے تاکہ ملک و قوم کی خدمت اور علم و دانش پر احسان کے ساتھ ساتھ مختلف قوموں اور زبانوں کے ماہرین کے افکار سے اپنے محققین کو بھی آشنا کیا جاسکے۔ اسی نظریہ کے پیش نظر مترجم نے موضوع اور مطالب کے اعتبار سے ایک نہایت منفرد اور غنی تحقیق کو اردو زبان دانشوروں، محققین اور طلباء کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ یہ مقالہ تہران یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر حسن حضرتی کا ریسرچ ورک ہے جو انبیاء اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی ثبوتی اور اثباتی شان کے موضوع پر بحث کرتا ہے۔ یقیناً اس مقالے کا ترجمہ اردو زبان مؤرخین، متکلمین اور طلباء کو علمِ تاریخ اور علمِ کلام کے اشتراک سے ایک نئی جہت سے متعارف کرائے گا۔ اس ترجمہ میں کوشش کی گئی ہے کہ اصلی مفاہیم اور مطالب کو نہایت امانداری کے ساتھ منتقل کیا جائے۔ البتہ بعض مقامات پر اپنے قارئین کے ذوق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کچھ اضافی مطالب کو نظرانداز اور کچھ دیگر مفاہیم کی جگہ بدل دی گئی ہے، جیساکہ اصلی مقالہ کے خلاصہ کا دوسرا پیراگراف خلاصہ کے حجم میں اضافہ کے پیش نظر، مسئلہ تحقیق کے ذیل میں فٹ نوٹ میں بیان کیا گیا ہے وغیرہ۔ جو لوگ جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ فارسی زبان میں ڈاکٹر حسن حضرتی کا قلم نہایت سنگین ہے کہ جسے سمجھنے میں اہل زبان کو بھی بعض اوقات لغت سے مدد لینا پڑتی ہے۔ لہٰذا مجھے بھی متعدد مرتبہ یہ زحمت اٹھانا پڑی اور کئی ایک لغات کی مدد سے پیچیدہ جملات اور مشکل الفاظ کا ادراک حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس ترجمہ میں ابھی بھی کمی اور بہتری کا امکان موجود ہے کہ جس پر ارباب دانش اور خصوصاً اہل زبان سے معذرت کے ساتھ ملتمس ہوں کہ وہ مجھے میری علمی اور ادبی خامیوں کی نشاندہی کا تحفہ دے کر احسان فرمائیں گے۔

1۔ تاریخ شناسی

تاریخ شناسی ایک ایسا علم ہے کہ جس کی ممترین خصوصیت انسانی زندگی سے مربوط حوادث اور واقعات کو طبیعی، مادی اور سائنسی طریقہ کار سے دیکھنا ہے لہٰذا یہ علم ان تمام ابزار و وسایل کو بروئے کار لاتے ہوئے کہ جو مورخین کے ہاں رائج ہیں، موضوعات کو بالکل سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے معجزات، کرامات اور علم غیب وغیرہ کی تصدیق نہیں کرتا ہے۔ اسی لئے ان موضوعات کو علم کلام کی ابحاث شمار کرتے ہوئے ان سے چشم پوشی کرتا ہے لہٰذا علم تاریخ صرف اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ جو مادی انداز میں زمین پر واقع ہوئی ہو، اور بقیہ مافوق الطبیعت اور خارق عادات کو کسی بھی صورت نہیں مانتا ہے، اس طرح مورخین کے نزدیک کسی شخص کا باکرامت، صاحب معجزات یا روحانی شان کا حامل ہونا وغیرہ اس قدر تائید شدہ نہیں جتنا کہ متکلمین کے ہاں ہے۔

کیونکہ وہ ان صفات کو الٰہی نصرت اور غیبی طاقت کے ضمن میں شمار کرتے ہوئے انہیں آئمہ طاہرینؑ کی سب سے بڑی شان تصور کرتے ہیں جبکہ مورخین ان کی کامیاب مادی زندگی کو ان کی عظمت تصور کرتے ہیں۔

2۔ بیان مسئلہ

علم تاریخ ایک ایسا علم ہے کہ جس کا ہدف اپنے پیش نظر موضوعات کی سائنسی شناخت حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا مورخین کے پیش نظر ایسے موضوعات ہوتے ہیں کہ جو بالکل طبیعی، مادی اور سائنسی طرز کے ہوں کہ جن کو سمجھنا اور درک کرنا ہر عام و خاص کے لئے ممکن ہو۔ البتہ بعض اوقات مورخین کچھ ایسے تاریخی موضوعات کو بھی مورد بحث قرار دیتے ہیں کہ جو اگرچہ ماضی اور گذشتہ زمانے سے مربوط ہوتے ہیں لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے طبیعی اور مادی نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ تاریخی نقطہ نظر سے ان موضوعات کا سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ معجزاتی حیثیت کے حامل انسانوں (آئمہ طاہرینؑ) کے خارق العادت افعال و اعمال جو کہ طبیعی طور پر مادی دنیا میں محقق ہو چکے ہیں، تاریخی موضوعات شمار ہوتے ہیں اس لئے بعض مرتبہ مورخین ان کی شناخت حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ بشریت میں معجز نما ہستیوں سے مربوط تحقیق کرنا درحقیقت انہی مافوق طبیعی موضوعات کو زیر بحث لانا ہے کہ جو مورخین کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ البتہ تاریخ میں جو کچھ ان بزرگ ہستیوں کے ہاتھوں انجام پا چکا ہے وہ سب کا سب طبیعی اور عمومی نہیں، بلکہ ان کے بہت سارے امور معجزاتی اور غیر طبیعی تھے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تمام تر خصوصیات عام انسانوں جیسی نہیں تھیں، بلکہ وہ عمومی انسانی خصوصیات کے ساتھ ساتھ آفاقی خصوصیات کے حامل بھی تھے: جیسے معجزہ کرنا، کرامات دیکھانا، غیب کی باتیں کرنا، ہر طرح کے گناہوں سے معصوم اور پاک ہونا اور خداوند متعال کے ساتھ گہرا رابطہ ہونا وغیرہ کہ جنہیں تاریخی طریقہ کار سے ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ یقیناً ایسے اعتقادات کے بارے میں خود شیعہ علماء کے درمیان بھی اختلافات پائے جاتے ہیں کہ جن کا ذکر حتی قدیمی ترین بزرگ علما کے ہاں بھی قابل مشاہدہ ہے کہ جس کا بیان اس تحریر میں ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ یہ موضوع نہ تو اس تحقیق کا مسئلہ ہے اور نہ ہی اسے بیان کرنے کی گنجایش ہے۔ البتہ محققین بیشتر آگاہی حاصل کرنے کے لئے ذیل میں دی گئی کتب کی طرف رجوع کریں:

1. محمد، ابراہیم نعمانی، *الغیبہ* (تہران، مکتبہ الصدوق، 1379) 44۔
2. شیخ، صدوق، *معانی الاخبار* (قم، انتشارات جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، 1361) 132۔
3. پیشین، *کمال الدین وتمام النعمہ*، ج2 (قم، دار الکتاب الاسلامیہ، 1359ق) 361 و5۔
4. شیخ، مفید، *تصحیح الاعتقادات الامامیہ* (بیروت: دار المفید، 1414ق) 128۔

5. ابوالصلاح، حلبی، الکافی فی الفقہ، تحقیق: رضا استادی (اصفہان، مکتبہ امیر المومنین، 1403ق) 174۔
6. محمد بن حسن، طوسی، الاقتصاد الہادی الی طریق الرشاد، تحقیق: حسن سعید (تہران، مکتب جامع چہل ستون، 1400ق) 113۔

لہٰذا مسائلہ یہ ہے کہ کیا مورخین کے بس میں ہے کہ وہ ایسے انسانوں کی طبیعی اور مافوق طبیعی یا مادی اور معنوی زندگی کے درمیان عقلی اور منطقی رابطہ برقرار کرسکیں کہ علم تاریخ سائنسی طریقہ کار سے جس کی تائید اور تصدیق کرے، اور ان مقدس شخصیات کی پہچان اور معرفت مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں سے ہونے پائے ناکہ ایک پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے دوسرا متعارف کروا دیا جائے یا دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لاکر کھڑا کر دیا جائے وغیرہ؟ کیا ان دونوں خصوصیات (مقام اثباتی اور مقام ثبوتی) کا تاریخی نکتہ نظر سے ایک مقام پر اکٹھا ہونا ممکن ہے؟ یا یہ کہ مجبوراً ایک خصوصیت کو ثابت کرنے کے لئے دوسری کی سرے سے نفی کرنی پڑے گی؟ دوسرے الفاظ میں کیا یہ ممکن ہے کہ ائمہؑ کے مقام ثبوتی اور مقام اثباتی کو تاریخی تحقیقی نکتہ نظر سے ثابت کیا جائے یا پھر یہ کہ تاریخی روش کے مطابق ان کے مقام ثبوتی کو نظرانداز کرکے مقام اثباتی پر ہی اکتفا کرلیا جائے؟ اور اگر ایسا کرلیا جائے تو پھر ایسا ممکن ہے کہ ایک امام معصوم کو اس کی صحیح تعریف کے مطابق پہچانا جاسکے جبکہ ان کی کرامات، معجزات، عصمت اور علم غیب جیسی خصوصیات سے چشم پوشی کی گئی ہو؟ کیا ایسی امام شناسی حقیقی اور واقعی امام شناسی ہوسکتی ہے؟ جو کچھ مذکورہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے اس کے پیش نظر اس تحقیق کے اصلی سوال کو اس طرح بیان کریں گے کہ: تاریخی تحقیق میں کس طرح معجز نما انسانوں کے مقام ثبوتی اور مقام اثباتی کو ایک ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے تاکہ ان کی ذات کی حقیقی، صحیح اور مکمل معرفت اور شناخت حاصل ہوسکے؟ اگر یہ اختلاط ممکن ہے تو کس طرح اور اگر ممکن نہیں تو کیوں اور کیسے؟ یہ اس صورت میں ہے کہ ان ہستیوں سے وابستہ مقام اثباتی (عام انسانوں کے ساتھ مشترک ہونا) علم تاریخ کے زمرے میں آتا ہے جبکہ مقام ثبوتی (عام انسانوں سے منفرد ہونا) مکمل طور پر علم کلام کی بحث شمار کی جاتی ہے۔ اس لئے اس تحقیق میں کوشش کی گئی ہے کہ دونوں علوم کی جداگانہ تعاریف کرتے ہوئے مذکورہ بالا شخصیتوں کی درست اور صحیح معرفت حاصل کی جائے، ایسی معرفت جو کہ بنی نوع انسان کے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرہ سازی کرسکے۔

2۔ علم تاریخ کی تعریف اور اس کا دائرہ کار

شاید مشکل ترین کام کسی علم کی صحیح اور دقیق تعریف کرنا ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سطور کا مؤلف اس کوشش میں ہے کہ علم تاریخ کی شناخت حاصل کرتے ہوئے اس کی صحیح تعریف کرے تاکہ اس علم کی معرفت کے ساتھ اس کی حدود و قیود کا تعین کیا جاسکے۔ قدیمی دانشوروں کے نزدیک علم تاریخ کو مخصوص معانی

اور مفاہیم تک محدود نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی ان کے ہاں اس علم کا کوئی ایک معنا سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے سقراط نے اسے (علم تاریخ کو) شناخت کے معنوں میں لیا، ارسطو نے کہا تاریخ ماضی کے واقعات اور ان کی اسناد کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا نام ہے۔ [1]البتہ ان کے درمیان ایک گروہ وہ بھی ہے جو کہ بالکل علم تاریخ کی کسی تعریف کا قائل ہے ہی نہیں، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ یہ علم نہ تو کسی خاص موضوع تک محدود ہے اور نہ ہی اس کی حدود اور دائرہ کار کا تعین کیا جا سکتا ہے، مثلاً: شوپنہاور معتقد تھا کہ: بنیادی طور پر تاریخ ایک اعلی طبقہ بندی کا نام ہے کہ جس کی دوسرے علوم کی طرح کوئی خاص تعریف اور وقت کی قید لگا کر طبقہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے وہ علم تاریخ کے موضوع کو بھی کبھی نہ ختم ہونے والا موضوع بیان کرتا تھا، اس لئے اسے کسی خاص موضوع تک محدود رکھنے کا قائل نہیں تھا۔[2] لہٰذا اگر ہم قدیمی مورخین کی روش پر چلتے ہوئے یہ کام انجام دینا چاہیں، تو پھر ضروری ہے کہ ہم اپنی تعریف کو موضوع، روش اور ہدف علم تاریخ جیسے تین پایوں پر استوار کریں۔

ان سطور کے مؤلف اور دیگر مورخین کی نظر میں علم تاریخ کا موضوع انسان ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں انسان ہو گا وہیں تاریخ بھی ہو گی اور جہاں انسان نہیں وہاں تاریخ بھی نہیں ہو گی۔ لہٰذا تاریخ کا اصلی اور مستقل موضوع انسان ہے اور اس کے علاوہ باقی تمام موضوعات مورخین کے نزدیک ثانوی حکم میں آتے ہیں اسی لئے وہ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ پس تاریخ شناسی سے مراد وہ علم، کہ جو صرف انسان اور اس کے افعال کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ اگر تاریخ میں غار حرا، چاہ زم زم یا حجر اسود کی اہمیت ہے تو اس کی وجہ ان کا کسی انسان کے ساتھ وابستہ ہونا ہے اور اس کے قدموں کے نشانات کی برکت سے ہے۔ ورنہ وہ خود اس قابل نہیں کہ مورخین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز کر سکیں۔ اس طرح جو کچھ عالم مادہ میں واقع ہوا اور انجام پا چکا ہے وہ سارے کا سارا علم تاریخ کے موضوع میں شمار نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر طبیعت اور ماضی کا تاریخی مفاہیم کے ساتھ فرق واضح اور آشکار ہوتا ہے۔

سوشل سائنسز کے ماہرین اور انسانی علوم کے مفکرین شاید اٹھارویں صدی عیسوی میں تاریخ اور طبیعت کے دو الگ الگ مفاہیم ہونے کے قائل ہوئے ہیں جبکہ اس سے پہلے وہ تاریخ اور طبیعت کے مفاہیم کو ایک ہی تصور کرتے ہوئے ان کے مابین کسی قسم تفاوت کے قائل نہیں تھے۔ جیسا کہ کانٹ تاریخ اور طبیعت کے بارے میں اسی نظریہ کا قائل تھا[3]: وہ کہا کرتا تھا کہ اگر تاریخ ایک منظر کا نام ہے، تو پھر وہ واضح اور آشکار ہے اور جب وہ منظر واضح اور آشکار ہے تو اسی کا نام طبیعت ہے۔ لہٰذا طبیعت ایسی چیز کا نام ہے کہ جو ایک منظر کی طرح دکھا دی گئی ہو۔ یوں اٹھارویں صدی کے مفکرین تاریخ کو ایک منظر کی طرح دیکھتے ہوئے تاریخ کو طبیعت کے ماتحت تصور کرتے ہیں، اس کے علاوہ وہ تاریخی ایام کو منٹسکو کی نظر میں، جغرافیا اور اقلیم شناسی کے ماتحت، یا ہرڈر کی نظر میں، اسے

انسان شناسی کے قوانین کے تابع تصور کرتے ہیں[4]۔ لیکن انیسویں صدی کے مفکرین نے اس موضوع پر اپنا نکتہ نظر بدلتے ہوئے اس کے برعکس نظریہ پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ہگل تاریخ اور طبیعت کے درمیان ایک بنیادی تفاوت کا قائل ہے لہٰذا اس کا اصرار ہے کہ طبیعت اور تاریخ دو بالکل جدا اور مختلف چیزیں ہیں کہ جو کسی بھی صورت میں ایک نہیں پس وہ طبیعت اور تاریخ کے درمیان واضح فرق کا قائل ہے۔

اس نظریہ پر اس کی دلیل یہ ہے کہ: طبیعی حوادث، کسی تفکر اور تعقل کے بغیر ہمیشہ تکرار(Repetition) ہوتے رہتے ہیں جیسے، سورج طلوع ہوتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے، درختوں کے پتے بہار میں نکل آتے ہیں اور خزاں میں خشک ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح اگلے سال پھر یہی صورت حال تکرار ہوتی ہے، جبکہ اس کے برعکس تاریخ نہ کبھی لوٹ کر آتی ہے اور نہ ہی تاریخی واقعات اپنا چکر پورا ہونے پر اگلے سال پھر نئے سرے سے شروع ہوتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ کا سفر گول دائرہ کی شکل کا نہیں بلکہ نہایت پیچیدہ اتار چڑھاؤ کا حامل ہے۔ اس لئے کوئی تاریخی واقعہ ایسا نہیں کہ جو عین اسی اگلے واقع کی طرح دہرایا گیا ہو۔ پس تاریخ میں اتار چڑھاؤ ہے لیکن یہ لوٹ کر واپس آنے کی صفت نہیں، بلکہ تاریخ ہمیشہ آگے ہی بڑھتی رہتی ہے۔ نتیجتاً کہا جا سکتا ہے کہ طبیعی واقعات سے آگاہی کے لئے ضروری ہے کہ مورخ باہر سے ان کا مشاہدہ کرے اور انہیں دیکھے جبکہ تاریخی واقعات کی حقیقت جاننے کے لئے لازم ہے کہ مورخ ان کے اندر جھانک کر دیکھے، ان واقعات اور حوادث کے رونما کرنے والے محرکین کے افکار اور خیالات کو اپنے ذہین میں لائے یہاں تک کہ خود کو ان کی جگہ پر لا کر کھڑا کرے وغیرہ۔ اس طرح کبھی بھی تاریخی واقعات کی حقیقت کا ادراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کے پیچھے ذہنیت، افکار، خواہشات اور محرک کو مدّ نظر نہ رکھا جائے۔[5]

اگرچہ اس بنیاد پر کالینگووڈ، ہگل کے دلائل کے ساتھ کسی حد تک متفق ہے لیکن وہ ان کے اندر کچھ اصلاحات کا خواہشمند بھی ہے کہ جن کا بیان موضوع تحقیق سے ہم آہنگ نہ ہونے کے سبب نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ناقابل انکار ہے کہ طبیعی عمل (Natural Process) تاریخی عمل (Process Historical) سے مختلف ہے۔ کیونکہ زمین شناسی کا علم، ہمیں روی زمنین پر رونما ہونے والے تمام واقعات اور حوادث سے آگاہ کرتا ہے جبکہ علم تاریخ اس کے برعکس صرف انسان اور اس سے مربوط امور تک محدود رہتا ہے کیونکہ اگر یہ علم بھی وہی کام کرے جو زمین شناسی کے دائرہ میں آتا ہے تو اس وقت یہ علم تاریخ نہیں کیونکہ ہگل کے بقول دنیا میں کسی شے کی تاریخ، تاریخ کہلوانے کی حق بجانب نہیں مگر انسان کی تاریخ کہ جو عقل و فکر کا حامل ہے۔[6] یوں طبیعت اور تاریخ کے درمیان فرق کو نہ ماننا مختلف علوم کی ترتیب (Classification) کو مشکل سے دچار کر دیتا ہے۔ کیونکہ جہان شناسی اور زمین شناسی جیسے علوم پورے عالم طبیعت اور زمین کی قدامت کو زیر بحث لاتے ہیں جبکہ تاریخ ایسی نہیں،

اس لئے کہ اگر تاریخ کا موضوع ہم زمین کا ماضی تصور کرلیں تو پھر تاریخ، زمین شناسی اور جہان شناسی کے درمیان فاصلہ اور ان کی حدود و قیود صحیح طریقے سے بیان نہیں ہو پائیں گی۔ اسی لئے بڑے بڑے مورخین جیسے ہگل، کروچہ اور کالینگووڈ تاریخ اور طبیعت کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔

البتہ خود مورخین کے ہاں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ علم تاریخ اور مورخین انسان کی کس بات اور کن عوامل کو موضوع بحث قرار دیں؟ اس کے جواب میں کالینگووڈ کہتا ہے کہ لوگوں کے افعال اور ماضی میں انجام دئے گئے امور وغیرہ کو۔[7] جبکہ یہ تعریف بھی مورد تنقید قرار پاتی ہے کیونکہ مکتب آنال (اور خصوصاً لوسین فور) نے کہا کہ اگر مورخین تاریخی نفسیات کے علم سے عاری ہو کر تاریخی موضوعات کا تجزیہ اور تحلیل کریں گے تو حوادث تاریخی کی اصل حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر پائیں گے کیونکہ دامن تاریخ میں، انسانی زندگی سے مربوط بہت ساری ایسی تاریخیں ہیں کہ جو ابھی تک نظر انداز کی گئی ہیں جیسے: تاریخ عشق، تاریخ رحم و بے رحمی اور اسی طرح تاریخ خوشی یا غم وغیرہ کہ جو اگرچہ انسان کے ساتھ مربوط تو ہیں لیکن ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ لہٰذا انسان کے احساسات اور جذبات تاریخی تحقیقات سے ابھی تک باہر تصور کئے جاتے ہیں کہ جن پر کسی طرح کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔[8] اگرچہ سوال کہ انسانی زندگی کے کس شعبے کو تاریخی موضوع بنایا جائے اور کس شعبے کو نظر انداز کیا جائے؟ ابھی تک تشنہ ہے کیونکہ مورخین اس کے بارے میں کوئی آخری اور قطعی فیصلہ دینے کے قابل نہیں ہو پائے ہیں۔ البتہ موضوع تاریخ کے حوالے جو بات تمام مورخین کے ہاں مشترک ہے وہ یہ کہ علم تاریخ کا موضوع انسان ہے اور اس مقالہ میں اسی مشرک نکتہ پر اکتفا کرتے ہوئے اس شعبے میں مورخیں کے نزاع اور اختلافات کے بیان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

موضوع کے عنوان سے تاریخ شناسی دیگر انسانی علوم (Humanism) کے ساتھ اشتراک رکھتی ہے، جبکہ روش کے عنوان سے تاریخ ایک ایسا علم ہے کہ جو دیگر تمام انسانی علوم سے منفرد ہے۔ کیونکہ تاریخ شناسی کی روش حقیقت، استناد اور اثبات کی روش ہے یعنی یہ علم حقیقت، واقعیت اور عملی علم ہے کہ جو نہ فقط تاریخی حقایق کو بیان کرتا ہے بلکہ نئے حقایق کو جنم بھی دیتا ہے۔ مثلاً جب مورخین کے پاس جو تاریخی خبر مختلف ذرائع سے ماضی کی پہچان حاصل کرنے کے لئے پہنچتی ہے وہ صرف اور صرف اطلاعات اور مفروضہ (Data) ہوتا ہے کہ جس کے بارے میں شروع ہی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غلط ہے یا صحیح۔ کیونکہ تاریخ کے دامن میں اس کے بارے میں قضاوت کرنے کا امکان اتنا واضح اور آشکار نہیں ہوتا کہ ہر کوئی فوراً اس کے بارے میں فیصلہ سنا دے۔ لہٰذا یہاں سے مورخین کا کام شروع ہوتا ہے اور وہ کام یہ ہے کہ مورخین اس مفروضے یا تاریخی خبر (Data) کو حقیقت (Fact) میں تبدیل کرکے دکھائیں۔

اس راہ میں مورخین کے پاس جو سب سے مضبوط ہتھیار ہے وہ تاریخی عقل ہے۔ عقل تاریخی سے مراد یہ ہے کہ تاریخی حوادث اور اسناد کے بارے میں عقلمندانہ فیصلہ کرنا۔ اس میں تاریخی شواہد، قرائن، اسناد اور مکتوبات جمع کئے جاتے ہیں اس کے بعد ان کا تجزیہ، تحلیل، جرح (Mayhem) اور تغیر و تبدل (Modification) کیا جاتا ہے کہ جن کی بنیاد پر انسانی تاریخ کے بارے میں قضاوت کی جاسکے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ تاریخی عقل وہ عقل ہے کہ جس کا طریقہ کار انسانی حوادث اور ان کے تاریخی واقعات کے بارے میں طبیعی، منظّم، مادی اور سائنسی ہوتا ہے۔ ایسی عقل کہ جو طبیعی اسباب اور وجوہات پر اکتفا کرتے ہوئے انسانی زندگی سے مربوط تاریخی موضوعات کی چھان بین کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل تاریخی اور عقل غیر تاریخی (عقل محض) ممکن ہے کہ تاریخی موضوعات سے مربوط ایک جیسی قضاوت نہ کر پائیں یا یہ کہ ممکن ہے غیر تاریخی عقل کسی واقعہ کے بارے میں مثبت فیصلہ سنائے جبکہ عقل تاریخی عین اسی وقت اس کے برعکس۔ مثال کے طور پر اگر کسی تاریخی کتاب میں یہ بات آئی ہو کہ سلطان محمود غزنوی نے دس لاکھ فوجیوں کے ہمراہ ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ یہ مفروضہ ممکن ہے عقل محض کے نزدیک صحیح اور درست تصور کیا جائے لیکن تاریخی عقل اس کو اتنی سادگی کے ساتھ تائید نہیں کرسکتی۔ کیونکہ تاریخی عقل، عقل محض کے برخلاف صرف ایک واقعہ کے رونما ہو جانے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس واقعہ سے مربوط مفروضات کو تاریخ کے تراوزو پر رکھ کر ایسے فلٹر (Filter) سے گزارے گی کہ جن میں تاریخی شرائط اور اس کے وقوع پذیر ہونے کے امکانات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گیا ہو اور یہ سارا پراسس کرنے کے بعد اس واقعہ کے بارے میں کوئی فیصلہ دے گی۔ لہٰذا تاریخی شرائط اور حادثے کے رونما ہونے کی شرائط ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس کو صرف عقل تاریخی کے تناظر میں تجزیہ کرتے ہوئے فیصلہ سنادیں بلکہ بہت سارے تاریخی دلائل، عوامل اور وجوہات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کے پاس تعداد کے اعتبار سے اتنی بڑی فوج کا ہونا ناممکن اور محال تھا۔

دوسری طرف تاریخی عقل کے بارے میں اس نکتہ کو بھی اس تحقیق کا اصلی مسئلہ شمار کیا جاسکتا ہے کہ کلامی نکتہ نظر کا امام شناسی کے بارے میں تاریخی نکتہ نظر کے ساتھ کس حد تک تعلق ہے اور ان کا آپس میں کیا رابطہ ہے جبکہ تاریخی عقل وہ عقل ہے کہ جو سائنسی طریقہ کار سے تاریخی مفروضات، حوادث اور واقعات کی طرف نگاہ کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی عقل مابعداز طبیعت کے حوادث، واقعات اور تجزیات کو بیان کرنے سے قاصر ہے کیونکہ تاریخی عقل صرف از صرف انسانی زندگی سے مربوط اس موضوع کو زیر بحث لاتی ہے جو کہ طبیعی انسانی اور سائنسی ہو۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ مورخین کے پاس ایک تاریخی سند کی تحقیق کے لئے جتنے بھی ابزار، طریقے اور ذرائع ہیں وہ سب کے سب انسان کی مادی اور معاشرتی زندگی پر اطلاق کرتے ہیں۔ لہٰذا

مورخین سے کبھی بھی انسان کے مابعد از طبیعت سے مربوط مسائل کی تفسیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ وہ ایسے تاریخی طریقہ کار کے پابند ہوتے ہیں جو کہ ہمیشہ زمینی، انسانی، طبیعی، منظّم اور سائنسی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم تاریخ کی انتہا کیا ہے؟ کیا یہ علم اپنی آخری منزل پر دوسرے علوم کے ساتھ اشتراک کا حامل ہے بھی یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ علم تاریخ اپنی تہہ میں یقیناً دیگر علوم کے ساتھ مشترک ہے کیونکہ اس علم کی انتہا بھی دیگر علوم کی طرح حقیقت کی تلاش اور اس تک رسائی حاصل کرنا ہے یا باالفاظ دیگر ماضی میں انجام دئے گئے انسانی اعمال کی شناخت حاصل کرنا ہے۔ البتہ یہ جاننا کہ علم تاریخ کیسا علم ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ اس علم کے ذریعے شناخت مطلق اور حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکے یا یہ کہ یہ علم فقط قیاس اور موازنہ تک محدود رہتا ہے؟ یہ ایسے موضوعات ہیں کہ جو علم تاریخ کی انتہا اور غایت کے باب میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں مگر یہاں پر ان کا بیان ضروری نہیں لہٰذا ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اصلی موضوع کی طرف توجہ دیتے ہیں لیکن تاریخ کی انتہا کے ضمن میں صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور وہ یہ کہ مورخین اپنی تاریخی معرفت کی بنیاد پر جس بات کو اپنی آخری منزل قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ تطبیق، قیاس اور موازنہ کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ سے حقیقی معرفت یا معرفت مطلق کی تلاش بھی کرتے رہتے ہیں۔

3۔ علم کلام کی تعریف اور اس کا دائرہ کار

فارابی اس علم کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "کلام کا پیشہ، ایک ایسا ہنر اور مہارت ہے کہ جس کی مدد سے انسان بات چیت کے ذریعے ان تمام محدود اور معین افعال و آراء کی مدد کرے کہ جنہیں بانی شریعت نے واضح اور صاف صاف بیان فرما دیا ہے اور اسی طرح جو کچھ بھی ان آراء اور افعال کے برخلاف ہو اسے رد کر دے[9]۔

ابن خلدون نیز اس علم کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "علم کلام ایک ایسا علم ہے جو کہ عقلی دلائل کے ذریعے ایمانی اعتقادات کے اثبات اور اہل بدعت یا بدعت گزاروں کے انحرافات کو مذاہب سلف اور اہل سنت کے ان عقائد سے دور کرنے یا رد کرنے پر محیط ہے کہ جن کے تمام تر قوانین اور قواعد کا مجموعہ توحید ہے[10]۔

علم کلام کی سادہ اور عام فہم تعریف یہ ہے کہ یہ، وہ علم ہے کہ جس کے ذریعے دینی مصادر کی چھان بین کے ذریعے اعتقادی مسائل پر درست اور صحیح قیاس کیا جاسکے[11]۔ علم کلام کے ماہرین (متکلمین) کی سب سے اہم خواہش یہ ہے کہ وہ دینی عقائد کو ثابت کریں، ان سے متعلق صحیح فیصلہ کرتے ہوئے ان کا دفاع کریں۔ لہٰذا علم کلام اہم ترین فرض دینی اعتقادات کا دفاع کرنا سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس علم کے ہاں دفاع کرنے قدرت کافی زیادہ مضبوط ہے۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اس علم کی شکل و صورت کچھ اس طرح تھی کہ علم کلام دینی تعلیمات اور فرمایشات کا دفاع کیا کرتا تھا[12] جبکہ علم فقہ (Religious Jurisprudence) اس کے برعکس تفہیم دین کے لئے

کوشاں تھا، یہی وجہ ہے کہ علم کلام یا علم منطق ہمیشہ اپنے رقیب سے مقابلے کے لئے تیار دکھائی دیتے تھے۔ لیکن تیسری صدی ہجری کے بعد علم کلام کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ یہ علم دین کے دفاع سے، دینی نظریات کے مسائل (Religious Theoretical Issues) میں دلچسپی لینے لگا اور عمل وغیرہ کے مسائل کو فقہاء کے حوالے کر دیا یہ بات سبب بنی کہ علم کلام آہستہ آہستہ علم عقائد اور اصول دین کے علم میں تبدیل ہو گیا۔
آگے چل کر ایک اور بڑی تبدیلی جو اس علم کے اندر رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ اس علم نے اپنی دفاعی حیثیت کے ساتھ ساتھ، دین کے بیان کی ذمہ داری بھی خود اپنے ذمے لے لی۔ اس طرح دینی اعتقادی اصولوں کی تفہیم، جو کہ پہلے دینی فقہاء کی ذمہ داری تھی اب تیسری ہجری سے وہ بھی متکلمین کے فرائض میں شامل ہو گئی۔ تیسری صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک علم کلام نے اپنے فرائض میں یہ شامل کیا ہوا تھا کہ وہ دین کے دفاع کے ساتھ ساتھ دینی عقائد کو دلائل کے ذریعے ثابت بھی کرے گا۔ لہٰذا علم کلام میں رونما ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ علم کلام دینی عقائد کا علم ہے۔ اس بنیاد پر علم کلام کے بارے میں یہ رائے بھی قائم کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ علم ہے جو ایک دینی عقیدے، آئین یا مذہب کا دفاع کرتا ہے۔
علم کلام کی یہ خصوصیت کسی حد تک علم فلسفہ کے ساتھ بھی ملتی جلتی ہے۔ کیونکہ اگر خدا اور کائنات وغیرہ کے بارے میں ہر دین و مذہب کی قید سے باہر نکل کر آزادانہ ماحول میں بحث ہو اور یہ شرط بھی نہ ہو کہ اس بحث کا نتیجہ ہر صورت میں کسی نہ کسی دین کے موافق ہو تو ایسی بحث اور آئیڈیالوجی کو فلسفہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ بحث کسی بھی دین کی حمایت یا کسی دوسرے دین کی مخالفت کے پیش نظر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ دینی دائرہ کے اندر رہنے کی پابند بھی ہو تو ایسی بحث اور تحقیق کو علم کلام کہا جاتا ہے۔
سوال یہ ہے کہ علم کلام کا دینی عقائد کے اثبات اور دفاع کے حوالے سے کیا طریقہ کار ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ علم کلام ایسا علم تصور کیا جاتا ہے کہ جو کسی ایک روش کا پابند نہیں بلکہ کئی ایک روشوں (Polymethodic) پر مشتمل ہے اور ان روشوں سے استفادہ کے ضمن میں کسی بھی محدودیت کو قبول نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ موضوع کی مناسب کے پیش نظر وہ اپنی روش بھی بدل لیتا ہے تاکہ اپنے مدعا کو بہترین انداز سے ثابت کر سکے۔ اس طرح سے علم کلام میں برہان(logic or Argument) اور جدل (Disputant or Polemical) سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ علم کلام کی روش میں تنوع (Diversity) صرف استدلال کے حوالے ہی نہیں بلکہ متن اور مواد کے اعتبار سے بھی ہے۔ علم کلام کے بعض موضوعات جیسے: نبوت اور قیامت کی خصوصیات وغیرہ کو قرآن وسنت کی مدد سے ثابت کرتے ہیں، اس لئے اسے علم کلام نقلی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علم کلام کی بہت ساری دیگر مباحث بھی ہیں جیسے اللہ تعالی کی ذات اور اوصاف کو ثابت کرنا، نبوت عامہ اور اصل معاد وغیرہ کے اثبات کے لئے قیاس

، تکرار اور بحث و مباحثہ وغیرہ کہ جن کی بنیاد عقلی انصاف تصور کرتے ہوئے اسے کلام عقلی کہتے ہیں۔ متکلمین دینی عقائد کے استنباط میں دو منابع (عقل اور وحی) کا سہارا لیتے ہیں۔البتہ ان دو منابع سے استفادہ کے حوالے سے بھی مختلف ترجیحات ہیں۔ کچھ متکلمین جیسے معتزلہ وغیرہ اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ تمام اعتقادی معارف کو عقلی سمجھتے ہوئے، وحی الہی کو صرف عقلی فیصلوں کی تائید تک محدود کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک جو فیصلہ عقل کر دیتی ہے وحی آکر اسی کی تصدیق کرتی ہے اور بس۔ جبکہ کچھ دوسرے متکلمین جیسے اشاعرہ وغیرہ تمام واجبات کو حتی کہ معرفت خدا کے وجوب کو بھی اور اسی طرح ہر طرح کے حسن و قبح کو نقل سمجھتے ہیں۔[13]
بہر حال ماہرین علم کلام روش کو اپنے مدعا کی حقانیت کے اثبات کے لئے ہتھیار تصور کرتے ہیں اگرچہ وسیلہ جو بھی ہو، اس سے فائدہ حاصل کرنا ہر صورت میں جائز سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم کلام کے ماہرین آج تک ان تمام روشوں اور طریقوں سے جو کہ مختلف علوم میں مدعا کے اثبات کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہیں، استفادہ کرتے رہتے ہیں کہ جن میں فلسفی روشیں، سائنسی روشیں، تاریخی روشیں اور تفسیری روشیں وغیرہ شامل ہیں۔ ابھی تک جو کچھ علم کلام کے موضوع اور اس کی روش کے حوالے سے کہا گیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم کلام کا ہدف دین کی ساخت کا دفاع کرنا، عقائد اور دینی تعلیمات کی صحیح معرفت حاصل کرنا، انہیں ثابت کرنا اور ان کا ہر طرح کے شبہات کے مقابلے میں دفاع کرنا وغیرہ ہے۔

4۔ آئمہؑ کا ثبوتی اور اثباتی مقام

مسلمانوں میں بالخصوص شیعیان علیؑ کے عقائد کے مطابق رسول خدا کے بارہ خلفاء (جانشین) کہ جنہیں شیعہ مکتب فکر میں آئمہ طاہرینؑ کہا جاتا ہے، مقام اثباتی [14]، کے ساتھ ساتھ، مقام ثبوتی [15] کے حامل بھی ہیں۔ مقام ثبوتی وہ مقدس، آسمانی اور معنوی شان و منزلت ہے کہ جو اللہ تعالی اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے اور اس شان کے پیش نظر انہیں مخصوص اور منفرد قدرت اور خصوصیات عطا فرماتا ہے۔ منفرد خصوصیات سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان کا صاحب معجزات اور کرامات ہونا، علم غیب سے واقف ہونا، معصوم عن الخطاء ہونا اور ان سب سے بڑھ کر اللہ تعالی کی زمین پر اللہ تعالی کا منتخب شدہ نمائندہ ہونا کہ جو خلق اللہ کو راہ خدا کی طرف ہدایت کرنے کا ذمہ دار ہو۔ لہٰذا شیعہ کے نزدیک آئمہ طاہرینؑ ہی ایسے انسان ہیں کہ جو انبیای الہی کے بعد ایک طرف تو انسانی صفات کے مالک ہوتے ہوئے عام انسانوں جیسے ہیں، لہٰذا اکثر و بیشتر انہی بشری صفات کے پیش نظر دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے اعمال انجام دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بعض مخوص مقامات پر ضرورت کے وقت معنوی، قدسی اور الہی صفات کے بھی حامل ہو جاتے ہیں کہ جن کی مدد سے رسالت الہی کی انجام دہی میں ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا جب ضروری ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ معجزہ یا کرامات وغیرہ بھی کرکے دکھاتے ہیں تاکہ منکرین دین

کو اللہ تعالی کے دین کی جانب متوجہ کریں اور ان پر واضح کریں کہ ہم وہ انسان ہیں کہ جن کے پاؤں تو زمین پر ہیں لیکن سر پر آسمان و زمین کے مالک کا خاص لطف و نظر ہے۔

اس طرح یہ وہ انسان ہیں کہ جو بندوں اور خدا کے درمیان رابطہ اور واسطہ ہیں کیونکہ یہ پیغام خدا کو وحی اور الہام کی صورت میں دریافت کرتے ہیں اور بغیر کسی کمی یا زیادتی کے خلق خدا تک ابلاغ کرتے۔ لہٰذا امام کی شخصیت کے اس پہلو کو مقام ثبوتی کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ وہ انسان ہیں کہ جو تمام بشریت کے لئے اور خصوصاً مؤمنین کے لئے اسوہ، مقتدا اور با عمل پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی گفتار اور کردار ہم انسانوں کے لئے حجت اور سبب ہدایت اور ذریعہ نجات ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے کہ آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں کے تمام شعبہ جات امت کے لئے بہترین نمونہ اور قابل تقلید ہیں کہ جن کو اختیار کرتے ہوئے انسان سعادت دارین حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں کے اس حصے پر نگاہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقت میں اس قابل ہیں کہ ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے۔

5۔ تاریخی نکتہ نظر سے تاریخ شناسی اور علم کلام کے مابین رابطہ

جو کچھ مذکورہ بالا سطور میں کہا جا چکا ہے اس کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کلام زیادہ تر آئمہ طاہرینؑ کے مقام ثبوتی اور اس کا امام شناسی کے ضمن میں بیان ہے جبکہ علم تاریخ ان کے مقام اثباتی کو موضوع بحث قرار دیتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی زندگیوں کو عام انسانوں کے ساتھ ہم آہنگ، طبیعی اور تاریخ مند بیان کرے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ امام شناسی، ایک ذو مطالعاتی موضوع ہے اس لئے آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں سے مربوط ایک بہترین تحقیق انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ مورخین اور متکلمین ایک دوسرے کی علمی مدد کریں کہ جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔ ان سطور کے مؤلف کی نظر میں آئمہ طاہرینؑ کی ذات کے بارے کوئی تاریخی تحقیق انجام دینے کے لئے علم کلام اور علم تاریخ کا ایک دوسرے کے لئے معاون و مدد گار ہونا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں مؤلف کی نظر میں علم کلام اور علم تاریخ امام شناسی کے حوالے سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں کیونکہ ان دونوں علوم کے باہمی ربط سے ہی یہ موضوع صحیح طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ان دو علوم میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر کے امام شناسی پر بات کریں گے تو وہ بات ادھوری ہو گی اور اس طرح امام شناسی کے ذیل میں بہت سارے سوالات کے جوابات نہیں دے پائیں گے لہٰذا فریقین مجبور ہیں کہ اس باب میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔

جب ان دونوں علوم کے دانشور ایک دوسرے کی علمی معاونت پر رضامند ہو جائیں تو دوسرے قدم پر ان کی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ مذکورہ بالا دونوں علوم کے مابین نسبت اور تعلق کا دفاع کریں کیونکہ یہ نسبت امام شناسی

کے موضوع کو مکمل کرنے والی ہے ناکہ موضوع کے ذیل میں ایک دوسرے کے عیب چننے والی۔ اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیوں اور کس طرح یہ نسبت ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی ہے اور تنقیص کرنے والی نہیں؟ جواب یہ ہے کہ علم تاریخ اور علم کلام دونوں ایک ہی ہدف کے حصول میں کوشاں ہیں اور وہ ہے امامؑ کی صحیح شناخت۔ ایسا امام کہ جو دو صفات (شان ثبوتی اور شان اثباتی) کا حامل ہے اور یہ دونوں صفات ملکر اسے ہر طرح کی نقص و عیب سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک انسان کامل کے مقام تک پہنچاتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں مقام ثبوتی اور مقام اثباتی ایک ذات میں اکٹھے ہوگئے ہیں تاکہ اسے کمال کی منزل تک پہنچا دیں۔ اس لئے کیسے ممکن ہے کہ ایسے انسان کی معرفت حاصل کرنے کے لئے، دو علوم (علم تاریخ اور علم کلام) کے اشتراک سے کوئی تحقیق انجام نہ دی جا سکتی ہو؟ یعنی یہ وہ تحقیق ہے کہ جس کا مقصد امامؑ کی ذات میں موجود دونوں صفات کی ایک وقت میں ایک مقام پر کامل ترین معرفت اور آگاہی حاصل کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ جب ایک انسان میں دو مختلف علوم سے مربوط صفات کی شناخت کریں گے تو اس وقت ضروری ہو جائے گا کہ اولاً ان دونوں علوم کو ایک ساتھ ملا کر تحقیق کی جائے اور دوسرا یہ کہ محقق یا محققین دونوں علوم پر مکمل عبور رکھتے ہوں۔ وگرنہ یہ محال ہوگا کہ دو مختلف علوم سے مربوط صفات کے حامل انسان کی شناخت کسی ایک علم کی مدد سے کی جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر صفت کی صحیح پہچان کے لئے اس سے مربوط علم میدان میں آکر اپنا فریضہ انجام دے اور اسی طرح امام شناسی سے مربوط علوم بھی ضرور بالضرور ایک دوسرے سے مدد لیں۔ اگر ہم یہ گمان کر ہی لیتے ہیں کہ نہیں ایسا ممکن نہیں ہے اور اگر ایسا ہوا تو یقیناً اختلاف پیدا ہوگا، سوال، وہ کونسا اختلاف ہے جو اس کے ضمن میں پیدا ہو سکتا ہے؟

یہاں پر ہم ایک بات فرض کر لیتے ہیں کیونکہ فرض محال تو محال نہیں ہے، ممکن ہے یہ اختلاف سامنے آئے کہ جو ایک طرف علم کلام سے جڑا ہوا ہو اور دوسری طرف علم تاریخ سے، ایسے میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آئمہ طاہرین کے بارے معرفت کی بنیاد اگرچہ اعتقادات کلامی کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، علم تاریخ کے ضمن میں شمار کی جائے گی۔ کیونکہ علم کلام سے مربوط مفروضات بھی مؤرخین کی تائید کے نیاز مند ہیں۔ دوسرے الفاظ میں علم کلام کوئی ایسا دعوای نہیں کر سکتا کہ جس کی علم تاریخ تائید نہ کرتا ہو۔ کیونکہ کلام جس قدر دینی اعتقادات اور ان کے دفاع کے بارے میں کوئی بات کرتا ہے وہ درحقیقت انسان کی گذشتہ زندگی سے مربوط ہے، اور جو کچھ بھی ماضی سے مربوط ہے وہ علم تاریخ میں آتا ہے لہٰذا علم کلام نے اپنا مدعا علم تاریخ سے لیا ہوتا ہے۔ اس لئے تمام تر دینی دعوے اور واقعات کہ جو گذشتہ سے مربوط ہیں، ان کی تصدیق کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مورخین اس کی تائید کریں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی متکلم یہ دعوای کرتا ہے کہ: حضرت محمد (ص) اللہ تعالی کے پیغام کے

امین تھے۔ اس بات کی تصدیق کے لئے ضروری ہے کہ مورخین کی تائید حاصل کی جائے ورنہ متکلم کسی بھی صورت میں نہ تو اس بات پر دوسروں کا اعتقاد استوار کرسکے گا اور نہ ہی اس کی حقانیت کو ثابت کر پائے گا۔ یہ بات اس وقت درست کہی جا سکتی ہے کہ جب مورخین اس کے حق میں رائے دیں اور اس کی تاریخی نکتہ نظر سے تصدیق کریں۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کو دین تاریخی بھی کہا جاتا ہے۔

جب علم تاریخ دین کی مدد کرتا ہے تو اس وقت ہر طرح کے افسانے، من گھڑت قصے اور غیر تاریخی اعتقادات اس سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں۔ اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر یہ دعوای کیا جا سکتا ہے کہ ایک حوالے سے علم کلام بھی علم تاریخ کے ذیل میں آتا ہے کیونکہ متکلم امامؑ کی شان ثبوتی کے اثبات کے لئے تاریخ کا محتاج ہے، جبکہ مورخ امامؑ کی شان اثباتی کو ثابت کرنے کے لئے متکلمین کی تائید کا محتاج نہیں ہے۔ لہٰذا جو کچھ شان امامؑ کی شان ثبوتی کے حوالے سے کہا جاتا ہے اگر وہ زمان ماضی سے متعلق ہوگا تو یہاں پر مورخ صاحب اختیار ہے کہ وہ اسے تاریخی طریقہ کار کے پیش نظر قبول کرے یا رد کر دے۔ اس بناپر اگر کبھی ہم اس حد تک مجبور ہو جائیں کہ علم کلام یا علم تاریخ میں سے کسی ایک کی خبر کو قبول کریں تو بہتر ہے تاریخی خبر کو اولویت دی جائے۔ علم تاریخ کی علم کلام پر اس برتری کے علاوہ جو کہ معرفت شناسی کے ذیل میں ہے، اور بھی بہت سارے مقامات ہیں کہ جہاں پر علم تاریخ علم کلام پر فوقیت رکھتا ہے کہ جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

الف: جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ امام شناسی کے ضمن میں علم تاریخ زیادہ تر مقام اثباتی پر تاکید کرتا ہے جبکہ علم کلام مقام ثبوتی پر، اس طرح اگر آئمہ طاہرین کی معاشرہ میں بسر کی گئی زندگی پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری زندگی نظام فطرت کے عین مطابق، عام انسانوں جیسی تھی مگر یہ کہ بعض اوقات ضرورت کی وقت انہوں نے معمول سے ہٹ کر اپنی آسمانی طاقت اور قدرت کا اظہار کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں ان کی زندگیوں کے زیادہ امور مقام اثباتی سے متعلق تھے جو کہ بالکل قابل درک و فہم تھے، جبکہ چند ایک امور مقام ثبوتی کے ذیل میں بھی ملتے ہیں۔ اس تاریخی حقیقت سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ آئمہ طاہرین کی زندگی اور سیرت کے ساتھ تاریخی نکتہ نظر، کلامی نکتہ نظر کی نسبت زیادہ ہم آہنگ ہے کیونکہ ان کی زندگی کا دستور ایک معتدل انسانی زندگی بسر کرنا تھا۔ اس لئے ان کی زندگیوں کا زیادہ تر حصہ تاریخ سے متعلق ہے۔ یعنی ہم ان کے ایک ایک کام اور ایک ایک بات کو تاریخی طرز تحقیق سے اثبات کر سکتے ہیں۔ اس کے ذیل میں اگر چند ایک مافوق انسانی امور جیسے معجزہ اور کرامات وغیرہ آ جائیں تو اس وقت تاریخ کی بجائے ان کی تصدیق علم کلام کرے گا۔

ب: آئمہ طاہرین کی زندگیوں کو تاریخی نکتہ نظر سے دیکھنا ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم ان کے اعمال و گفتار کو اپنے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیتے ہوئے ان کی سیرت کو اپنے زمانے کے مطابق اپنی زندگیوں پر لاگو کریں۔ جیسا

کہ ہم آئمہ طاہرینؑ کو اپنا رہبر اور پیشوا سمجھتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی سیرت تمام پیروکاروں کے لئے اسوہ حسنہ اور مشعل راہ قرار پائے اور اسے عملاً ہماری زندگیوں پر نافذ ہونا چاہیے، لہٰذا اس حوالے سے ضروری ہے کہ ان کی سیرت طیبہ کی تاریخی نکتہ نظر سے تفسیر، تحلیل اور تجزیہ کیا جائے۔ اور اگر اس بات کو نظر انداز کرکے لوگوں کو سیرت طیبہ پر عمل کرنے کی دعوت دیں گے تو وہ زیادہ مفید نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کا مقام ثبوتی، وہ مقام نہیں کہ جس کے لئے پیروکاروں کو اس پر عمل کرنے کی وصیت کی جائے۔ مثلاً، کسی بھی وقت آئمہ طاہرینؑ نے ہم سے اس بات کا تقاضا نہیں کیا ہے کہ ہم ان سے کرامات سیکھیں اور پھر انہیں انجام دینے کے طریقے، بلکہ حقیقت ہے کہ یہ مافوق انسانی خصوصیت ہے کہ جو صرف انہی کو زیب دیتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے ہمیشہ ہمیں اس بات پر تاکید فرمائی ہے کہ کبھی بھی ظلم و ستم کے سامنے چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہ جائیں بلکہ دنیا میں عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لئے سخت سے سخت کوششیں کرتے ہوئے ظلم کا مقابلہ کریں۔ اور یہ وہ باتیں ہیں کہ جن کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے وہ خود بھی ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم آئمہ طاہرینؑ کو انسان اور عبادالرحمٰن کی نظر سے دیکھیں، یعنی ایسے بندے کے جن کا سر تو آسمانوں کے ساتھ ملا ہوا ہے لیکن پاؤں زمین ہی پر ہیں۔ وہ ایسے اعمال و افعال انجام دیا کرتے تھے کہ جو آسمانی ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل زمینی تھے کہ جن سے ایک عام انسان بھی سبق حاصل کرتے ہوئے، اپنے لئے اسوہ قرار دے کر ان کی صحیح اطاعت و پیروی کی ذریعے دنیا وآخرت کی سعادتیں حاص کر سکتا ہے۔

ج۔ آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں کو تاریخی نکتہ نظر سے دیکھنا ہمیں اس بات کا موقع بھی فراہم کرتا ہے کہ ہم ان بزگواروں کی سیرت کو عالمی ظلم و ستم کے مقابلے میں مجاہد اور (champion) متعارف کروائیں۔ جبکہ ان کی شان والا کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انہیں ایسے ہی متعارف کروایا جائے تاکہ ان بزرگ ہستیوں اور تا ابد عالمی شخصیتوں کو غیر انسانی خصوصیات اور مخصوص قسم کے ایسے اعتقادات میں محصور کرکے محدود نہ کیا جائے کہ جو صرف از صرف شیعوں کے لئے تو قابل فہم و درک ہوں جبکہ دوسرے ان سے مستفید نہ ہو سکیں۔ بلکہ کوشش کریں کہ ان کی سیرت طیبہ کو دنیا کی تمام زبانوں میں بین الاقوامی سطح پر تمام حریت پسندوں، عدل و انصاف کے طلب گاروں اور عالمی امن کے خواہشمندوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ ان کی صحیح پہچان حاصل کرتے ہوئے، انہیں اپنے لئے رول ماڈل قرار دیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دنیا کو امن و امان کا گہوارہ بنا سکیں۔ یہاں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ایسا امکان ہمیں صرف از صرف تاریخی طریقہ کار ہی فراہم کر سکتا ہے کیونکہ اس کی ادبیات ہر ایک کے لئے چاہے وہ کسی بھی دین و مذہب سے تعلق رکھتا ہو قابل فہم ہے۔ جبکہ کلامی روش، ایک ایسی دیدگاہ ہے کہ جس کی بنیاد صرف اس معرفت سے ہے کہ جسے حاصل کرنے کی لئے تفاسیر اور مفسرین کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

د۔ تاریخی روش آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں سے ایسے ایسے عقلی و نقلی بیانات پیش کرتی ہے کہ جن سے علم و دانش کے نئے نئے باب کھلتے ہیں جبکہ کلامی روش وہی پرانے اور تکراری جوابات دہراتی رہتی ہے۔ تاریخی روش ہمیں ایسے پیچیدہ سوالات کا جواب دیتے وقت کہ جیسے : امام حسنؑ نے امیر شام سے صلح کیوں کی اور امام حسینؑ نے یزید کے مقابلے میں قیام کیوں کیا یا پھر یہ کہ امام رضاؑ نے ولایتعہدی کو کیوں قبول کرلیا جب کہ وہ دلی طور پر راضی نہیں تھے وغیرہ وغیرہ ان تاریخی تجزیات اور زمینی حقایق سے روشناس کراتی ہے کہ جو اس زمانے کی شرائط کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اور سائل کو ایسے جوابات دیتے ہیں کہ جن سے اسے اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ آئمہ طاہرینؑ ایسے انسان تھے کہ جو بیک وقت بہترین سیاستدان، مصلح، کمال کے دانا اور آگاہ ترین افراد ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے اپنے زمانوں کی سیاسی اور اجتماعی شرایط کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے، تمام جوانب کو مد نظر رکھ کر حکمت پر مبنی اقدام اٹھایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی معنوی زندگی کے ذیل میں بہت بڑے عابد، مسئول اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی طرف سوفیصد متوجہ تھے لہٰذا وہ ہمیشہ اپنے علم و عرفان کو اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے بروئے کار لایا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ بہترین وقت میں بہترین فیصلے کیا کرتے تھے وغیرہ۔
اس کے برعکس کلامی نکتہ نظر عموماً ایک جیسا اور تکراری جواب دیتا ہے اگرچہ اس کے صحیح ہونے میں کسی طرح کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ کلامی نکتہ نظر مذکورہ بالا سوالات کے جوابات عموماً اس طرح دیتا ہے کہ : " امام حسنؑ نے صلح اور امام حسینؑ نے قیام اس لئے کیا تھا کہ انہیں اللہ تعالی کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا"، " وہ اپنے دینی فرائض انجام دے رہے تھے"، " اللہ تعالی کی مرضی یہی تھی" وغیرہ وغیرہ۔ ان جوابات میں سے کوئی ایک بھی قابل انکار نہیں، سبھی ٹھیک ہیں، لیکن امام شناسی کے باب میں ایسے جوابات کو اپنے اپنے مقامات پر بیان کیا جانا چاہیے تاکہ دونوں علوم ایک دوسرے کی مدد سے امام شناسی کے ذیل میں ایک دوسرے کی مدد و معاونت کرتے ہوئے، امام شناسی کے اس کام کو بطریق احسن انجام دے سکیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو حذف کرنے، رد کرنے یا نظرانداز کرنے سے ممکن ہے موضوع بحث تشنہ رہ جائے اور اس کا حق ادا نہ ہوسکے۔

نتیجہ

اس تحقیق کا اصلی مسئلہ یہ تھا کہ ایک تاریخی تحقیق میں کس طرح امام شناسی سے متعلق کلامی اور تاریخی روشیں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں اور ان کا آپس میں رابطہ کیسے برقرار کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں علوم اپنی ماہیت اور بنیاد میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ اور اگر ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھ کر بروئے کار لایا جائے تو یقیناً امام شناسی کے موضوع کا صحیح حق ادا کرنے میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ہیں۔ اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز کرنے سے، آئمہ طاہرینؑ کی صحیح معرفت مشکل عمل ہے۔ اس تحقیق میں ہم نے اس

بات پر بھی تاکید کی ہے کہ اگر کبھی ان دو علوم کے درمیان اختلاف نظر سامنے آجائے تو اس وقت تاریخی نکتہ نظر کو اولویت دینی چاہیے، کیونکہ علم کلام، امام شناسی کے حوالے سے، علم تاریخ کے ذیل میں آتا ہے، وہ اس طرح کہ علم کلام اپنے مدعا کی تصدیق تاریخی منابع و مصادر سے کرواتا ہے اس لئے مرکزیت علم تاریخ کو حاصل ہے، یہاں تک کہ دینی عقائد کی تصدیق و تردید کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو آخری فیصلہ علم تاریخ ہی کا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ دیکھیں: فلیسین شالہ، *شناخت روش ہای علوم*، ترجمہ دکتر مہدوی، (تہران، چاپخانہ تابان، 1323) 13۔

2۔ دیکھیں: کارل پوپر، *جامعہ باز و دشمنان آن*، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، چاپ اول (تہران، خوارزمی، 1369) 1114۔

3۔ مسعود امید، "*کانت و مسالہ تاریخ*"، سروش اندیشہ، سال چہارم، شمارہ دوازدہم و سیزدہم، ص 145۔

4۔ نقل از: آر. جی. کالینگوود، *مفہوم کلی تاریخ*، ترجمہ علی اکبر مہدویان، چاپ اول، (تہران، نشر اختران، 1385) 127۔

5۔ ایضاً، ص 148۔

6۔ ایضاً، ص 149۔

7۔ ایضاً، ص 17۔

8۔ ہنری استوارت ہیوز، *راہ فروبستہ*، ترجمہ عزت اللہ فولادوند (تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، 1373) ندارد۔

9۔ ابونصر محمد فارابی، *احصاء العلوم*، ترجمہ حسین خدیوجم (تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، 1364) 114۔

10۔ عبدالرحمٰن بن خلدون، *مقدمہ ابن خلدون*، ترجمہ محمد پروین گنابادی، ج 2، (تہران، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، 1326) 932۔

11۔ دیکھیں: جرجانی، *تعریفات* (تہران،...) 162. و . . "kalam", EI2 و قاضی عبدالجبار، ہمدانی، *المغنی*، ج 7 (...) 179۔

12۔ علی اصغر، حلبی، *تاریخ علم کلام در ایران و جہان اسلام*، چاپ اول (تہران، اساطیر، 1373) 35۔

13۔ دیکھیں: حلبی، وہی، صفحات اور فصول مختلف۔

14۔ انسانی یا مادی مقام جو کہ تمام انسانوں کے ساتھ برابر ہے۔

15۔ فراانسانی خصوصیات یعنی معجزات اور کرامات وغیرہ کا حامل ہونا۔

کتابیات

1) آر. جی. کالینگوود، مفہوم کلی تاریخ، ترجمہ علی اکبر مہدویان، تہران: نشر اختران، 1385۔

2) آشوب، ابن شہر، *مناقب آل ابی طالب*، قم: موسسہ انتشارات،...

3) فارابی، ابونصر محمد، *احصاء العلوم*، ترجمہ حسین خدیوجم، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، 1364۔

4) خلدون، عبدالرحمٰن بن، *مقدمہ ابن خلدون*، ترجمہ محمد پروین گنابادی، تہران: بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، 1326۔

5) شالہ، فلیسین، شناخت روش ہای علوم، ترجمہ دکتر مہدوی، چاپخانہ تابان، 1323۔

6) کارل پوپر، جامعہ باز و دشمنان آن، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، تہران: خوارزمی، 1369۔

7) امید، مسعود، "کانت و مسالہ تاریخ"، سروش اندیشہ، سال چہارم، شمارہ دوازدہم و سیزدہم۔

8) ہنری استوارت ہیوز، راہ فروبستہ، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، تہران: انتشارات علمی و فرہنگی، 1373۔

9) حلبی، علی اصغر، تاریخ علم کلام در ایران و جہان اسلام، تہران: اساطیر، 1373۔

10) جرجانی، علی بن محمد، تعریفات، تہران،...

11) ہمدانی، قاضی عبدالجبار، المغنی،...

12) EI2, "kalam". ۔

13) نعمانی، محمد ابراہیم، الغیبہ، تہران: مکتبہ الصدوق، 1379۔

14) صدوق، شیخ، معانی الاخبار، قم: انتشارات جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، 1361۔

15) صدوق، شیخ، کمال الدین و تمام النعمہ، قم: دار الکتاب الاسلامیہ، 1359ق۔

16) مفید، شیخ، تصحیح الاعتقادات الامامیہ، بیروت: دار المفید، 1414ق۔

17) حلبی، ابوالصلاح، الکافی فی الفقہ، تحقیق: رضا استادی، اصفہان: مکتبہ امیر المومنین، 1403ق۔

18) طوسی، محمد بن حسن، الاقتصاد الہادی الی طریق الرشاد، تحقیق: حسن سعید، تہران: مکتب جامع چہل ستون، 1400ق۔